درعیہ کی تباہی ۱۲ بجے کے قریب ہم درعیہ پہنچ گئے۔ یہ بڑی ہی سرسبز و شاداب جگہ ہے اور اس میں کھجور کے متعدد باغات پائے جاتے ہیں، جو سب کے سب کنوؤں ہی کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ ۱۸۱۸ء تک یہی جگہ آل سعود کا پایۂ تخت اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت اصلاح و تجدید کا مرکز رہی ہے۔ لیکن ۱۸۱۸ء میں مصر کے ترکی گورنر محمد علی پاشا کی بیوی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے حملہ کر کے اسے بالکل تباہ کر دیا، یہاں تک کہ آل سعود کو یہاں سے بھاگ کر ریاض کو اپنا مرکز بنانا پڑا۔ دور سے ساری بستی کھنڈرات اور مٹی کے بڑے بڑے ڈھیروں کا مجموعہ نظر آ رہی تھی۔ ہم نے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کی تباہی کے آثار کا مشاہدہ کیا۔ ساری بستی میں صرف چند بکھرے ہوئے گھر آباد ہیں، باقی ساری بستی ویران پڑی ہے۔ امراء آل سعود کے محلات کی دیواریں اپنے دروازوں اور کھڑکیوں سمیت اب تک قائم ہیں اور ان میں بعض کافی بلند ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ دیواریں کچی ہونے کے باوجود اب تک کیونکر قائم ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ اس علاقہ کی مٹی بڑی مضبوط ہے اور بارش یہاں کم ہوتی ہے۔ ایک جگہ کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہاں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی مسجد تھی۔ چودھری صاحب نے اس مسجد کے اور امراء آل سعود کے محلات کے چار فوٹو لیے۔ اس کے بعد ہم امیر عبداللہ کے قصر پہنچے۔ امیر اور ان کے ساتھ استاذ عبدالحکیم عابدین موجود تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مولانا سے تعارف و ملاقات کے لیے درعیہ کے بہت سے شیوخ کو بھی مدعو کر لیا تھا، جن میں شیخ عبداللہ بن خمیس بھی تھے۔ ہندوستان و چین کے تعلقات اور کشمیر کے بارے میں پنڈت نہرو کی پالیسی پر گفتگو ہوتی رہی۔ پاکستان کے مذہبی فرقوں، خصوصاً شیعہ حضرات کے متعلق بھی یہ لوگ بڑے سوالات کرتے رہے۔

عرب قومیت کا فتنہ ۳ بجے کے قریب دوپہر کا کھانا ہوا، بالکل مغربی طرز پر۔ مولانا نے کھانے کے دوران اپنی گفتگو میں عرب قومیت کے فتنہ کی خوب خبر لی اور ان لوگوں کو بتایا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان کا معاملہ، عربوں کے ساتھ اسرائیل کے معاملہ سے کسی طرح کم یا مختلف نہیں ہے لیکن عرب قومیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آپ کے اس ملک میں پنڈت نہرو آئے تو یہاں کے

بہت سے اخبارات نے انہیں رسول السلام (امن کا پیامبر) کا لقب دیتے ہوئے ان کا شاندار استقبال کیا، لیکن آپ ہی بتائیں اگر پاکستان کے لوگ بن گوریوں ۔۔ وزیر اعظم اسرائیل ۔۔ کو اپنے ہاں بلائیں اور پھر اس کا اس شان سے استقبال کریں، تو آپ لوگوں کی کیا کیفیت ہو؟ امیر عبداللہ نے اس بات کی مذمت کی کہ واقعی بعض عرب حکومتیں ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح دیتی ہیں، لیکن اپنی مملکت کے متعلق انہوں نے بتایا کہ یہاں بہرحال پاکستان کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔

کھانے کے بعد ہم نے امیر عبداللہ کے باغ کی سیر کی۔ کھجوروں کا سرسبز وشاداب باغ تھا جس میں کھجور کے علاوہ مالٹے اور سنگترے کے بھی درخت تھے۔ انگور بھی تھے۔ نارنگی کو یہ لوگ "یوسف آفندی" کہتے ہیں۔ آفندی ترکی لفظ ہے جو ہر اسم عَلَم کے بعد اسی طرح استعمال ہوتا ہے، جس طرح اردو میں 'صاحب' یا ہندی میں بابو۔ اردن، شام اور مصر میں بھی نارنگی کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ غالباً "یوسف" نامی کوئی صاحب ہوں گے جو پہلی مرتبہ نارنگی کا درخت ان ممالک میں لائے ہوں گے۔

عصر کے قریب ہم ریاض واپس ہوئے۔ راستہ میں کمال النجم کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ عرب قومیت سے متاثر ہیں۔ مولانا نے ان سے دریافت فرمایا کہ بتائیے آپ کے ہاں فلسطین میں عرب عیسائیوں کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ یہودی اور عرب علاقے کے درمیان بڑی سہولت سے آتے جاتے ہیں، جبکہ عربوں کے لیے اُدھر جانا اور یہودیوں کے لیے ادھر آنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مولانا نے دریافت فرمایا "آپ لوگ توقع رکھتے ہیں کہ اگر کبھی عربوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے، تو یہ عیسائی عربوں کا ساتھ دیں گے؟" انہوں نے جواب دیا کہ اس میں شک ہی ہے۔ مولانا نے فرمایا "مگر عالم اسلامی کے غیر عرب مسلمانوں میں سے ہر شخص آپ کا ساتھ دے گا"۔ اس پر استاذ کمال النجم نے کچھ کہا تو نہیں، مگر امید ہے کہ انہوں نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ہمارے عرب بھائی کس کی خاطر کس کی ہمدردی کھو رہے ہیں۔

کتابوں کا قیمتی ہدیہ عشاء کے بعد ہم استاذ عبدالحکیم عابدین کے ساتھ مفتی اکبر کے بڑے صاحبزادے

شیخ عبدالعزیز بن محمد کے ہاں گئے۔ انہوں نے ہمارے لیے پھلوں کی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ ریاض میں زیادہ تر پھل لبنان سے ہوائی جہاز کے ذریعے آتے ہیں۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا چونکہ بہت دیر سے کھاتے ہیں، اس لیے رات کو پھلوں وغیرہ کا ہلکا سا ناشتہ کر لیتے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بن محمد کے ہاں بعض اور لوگ بھی موجود تھے۔ سعودی عرب میں بادشاہ اور دوسرے امراء کے خرچ پر حدیث، عقائد اور فقہ کی بہت سی کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ شیخ عبدالعزیز ان کی اشاعت کے انچارج ہیں۔ انہوں نے ان کتابوں کا ایک ایک نسخہ ہدیۃً عنایت فرمایا جس پر ہم نے شیخ عبدالعزیز کا اور ان کے واسطے سے ان کے والد ماجد کا شکریہ ادا کیا۔ مولانا نے اپنی بعض عربی کتابیں (جو اس سفر کی حالت میں ہمارے ساتھ ہو سکتی تھیں) شیخ عبدالعزیز کی خدمت میں پیش کیں اور آئندہ وعدہ کیا کہ جب بھی کوئی نئی کتاب شائع ہوگی، ان کی خدمت میں بھیج دی جایا کرے گی۔

اگلے روز (۲۴ نومبر) ظہر کے بعد شیخ عمر بن حسن کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ ان کے ہاں پہنچے، تو شیخ اپنے ایک بزرگ شیخ عبداللطیف کے فتاویٰ "رسائل و مسائل" پڑھ رہے تھے اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے چند حضرات کو سنا رہے تھے۔ کچھ دیر ہم بھی سنتے رہے۔ آخر میں شیخ نے کتاب کا نسخہ جسے وہ پڑھ رہے تھے، مولانا کو بطور ہدیہ پیش کیا۔

سعودی حکومت کی عنایات کھانے کے بعد ہم شیخ عبدالعزیز بن باز کی مزاج پرسی کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ "پرسوں میں نے مولانا کے متعلق شاہ سعود کو — جو ان دنوں دمام میں تھے — تار دیا تھا، آج ان کا جواب آیا ہے اور انہوں نے دریافت فرمایا ہے کہ مولانا کے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں اور ان کا ارادہ کن کن مقامات کو دیکھنے کا ہے؟" شیخ نے اسی وقت ہم سے تمام مقامات کے نام معلوم کر کے بادشاہ کے تار کا جواب دے دیا۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ قائم مقام وزیر اعظم امیر مساعد نے ہمارے متعلق وزارت داخلہ اور وزارت تعلیم کو تار دے دیئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ان تاروں کے نمبر اور تاریخ کا رقعہ بھی بھجوا دیا۔

عصر کے بعد شیخ عبداللہ بن خمیس کے ہاں ہماری چائے کی دعوت تھی۔ شیخ نے ہمیں

اپنی دو مطبوعہ کتابیں "الادب الشعبی فی جزیرۃ العرب" اور "شہر فی دمشق" بطور ہدیہ عطا فرمائیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دو ماہ تک ان کا ارادہ ریاض سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا ہے[1]۔ اس کے لیے انہوں نے مولانا سے مضامین کا مطالبہ کیا۔ ہم نے وعدہ کیا کہ پاکستان واپس پہنچنے کے بعد مضامین کی ترسیل کا سلسلہ شروع کر دیں گے۔

فلبی سے ملاقات عشا کے بعد امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ہاں کھانے کی دعوت تھی امیر نے مولانا کے اعزاز میں بہت سے دوسرے امراء اور شیوخ کو بھی دعوت دی تھی۔ امیر عبداللہ نے اسی روز دوپہر کو مولانا کی کتاب "الربا" (سود) پڑھی تھی۔ کافی دیر تک اس کی تعریف کرتے رہے۔ سود کی حرمت پر مولانا نے انجیل سے استشہاد کیا تھا۔ اس مناسبت سے انجیل کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر ابن جریر کی تفسیر اور تاریخ موضوع گفتگو رہی۔ اندازہ ہوا کہ قدیم کتابوں کے متعلق بھی امیر عبداللہ کا کافی وسیع مطالعہ ہے۔

کھانے کے دوران معلوم ہوا کہ اسی میز پر مسٹر سینٹ جان فلبی (الحاج عبداللہ فلبی) بھی موجود ہیں۔ سینٹ جان فلبی مشہور انگریز مستشرق ہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جہلم کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ پھر ۱۹۱۶ء میں جنگی خدمات کے سلسلے میں عراق گئے۔ عرب جغرافیہ سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ نجد گئے اور وہیں شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر داخل اسلام ہوئے اور مستقل طور پر ریاض میں اقامت اختیار کر لی۔ عرب جغرافیہ کے متعلق ان کی بہت سی کتابیں ہیں جو اس قدر تحقیقی شمار کی جاتی ہیں کہ مغربی ممالک میں جب تک یہ کتابیں کسی مصنف کے سامنے نہ ہوں وہ عرب جغرافیہ کے متعلق کوئی چیز نہیں لکھ سکتا۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ فلبی ریاض میں موجود ہوں گے۔ لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ امیر عبداللہ کی اس دعوت میں موجود ہیں تو ہماری نگاہیں فوراً ان کی تلاش کے لیے اٹھ گئیں۔ وہ ہمارے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے مگر بالکل عربی لباس میں تھے اور رنگ میں بھی انگریزوں جیسی سرخی نہ تھی۔ اچھی خاصی ڈاڑھی بھی تھی اس لیے ہم انہیں نہ پہچان سکے۔ کھانے

---

[1] یہ رسالہ مارچ ۱۹۶۰ء سے "الجزیرۃ" کے نام سے جاری ہو گیا ہے اور ہمارے پاس مسلسل آ رہا ہے۔

کے بعد امیر عبداللہ نے خاص طور پر ان کا مولانا سے تعارف کرایا اور پھر دونوں میں چند منٹ تک گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو عربی میں کرتے تھے اور بقول مولانا کے بالکل بدوؤں کی زبان انہی کے لہجے میں بولتے تھے۔ ان دنوں مولانا ان کی ایک تازہ مطبوعہ کتاب "IN THE LAND OF MIDIAN" (سرزمین مدین میں) کا مطالعہ کر رہے تھے جس میں انہوں نے مدین کی سرزمین کے حالات بیان کیے ہیں۔ اسی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ مولانا نے تفصیلی گفتگو کے لیے ان سے اگلے روز صبح کا وقت لیا۔ تاکہ سفر کے متعلق ان کی معلومات سے استفادہ کیا جا سکے۔ امیر عبداللہ اور فلبی کی مزاحیہ انداز میں خوب جھڑپ رہی۔ امیر عبداللہ نے بتایا کہ ان حضرت کی ساری کوشش یہ ہے کہ آثار کے ذریعے ان تمام چیزوں کو صحیح ثابت کیا جائے جن کا ذکر انجیل اور توراۃ میں آیا ہے۔ یہ نہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ حدیث کو۔ لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ یہ مجھ سے عربی اچھی جانتے ہیں حالانکہ ان کی عربی اتنی ہی ہے جتنی میری انگریزی۔" امیر نے ان کے جہل ــــ دراصل چالاکی ـــــ کی دو مثالیں بھی دیں۔ ایک یہ کہ ان کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم بادشاہ تھے، کیونکہ قرآن کہتا ہے:
"الم تر الی الذی حاج ابراھیم ان آتاہ اللہ الملک" اور انجیل سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ دولت مند آدمی تھے۔ دوسرے یہ کہ بلقیس (ملکہ سبا) اور حضرت سلیمانؑ کے درمیان ہزاروں سال کا زمانہ تھا۔

تمام لوگ یکے بعد دیگرے اجازت لیکر جانے لگے تو امیر نے مولانا کو روک لیا۔ پہلے فلبی ہی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ امیر نے بتایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس شخص کا اسلام محض جغرافی قسم کا ہے اور اس کے خیالات ابھی تک عیسائیوں جیسے ہیں، لیکن پھر بھی ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ یہ خائن یا انگریزوں کا جاسوس ہے، کیونکہ ہمارا تجربہ ہے کہ اس سے کوئی بات ہضم نہیں ہوتی؛ اور پھر چالیس سال کے عرصہ میں اس سے کوئی چیز ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے اس کے خائن یا جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا ہو۔" مولانا نے فرمایا "میرا خیال ہے کہ یہ شخص صرف اس لیے مسلمان ہوا ہے کہ اسے عرب جغرافیہ سے دلچسپی تھی، لیکن مسلمان ہوئے بغیر اس کے لیے جزیرہ

عرب میں گھر رہنا ممکن نہ تھا، اس لیے یہ مسلمان ہوگیا"۔ مولانا نے یہ بھی بتایا کہ میں نے اس کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، لیکن کسی سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے اسلام سے بھی کوئی تعلق ہے۔ ان دنوں میں اس کی کتاب "سرزمین مدین میں" پڑھ رہا ہوں۔ اس میں دو تین موقعوں پر اس نے صحراء میں کرسمس منانے کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر یہ کہ اس کی تمام کتابیں اس کے اصل نام سینٹ جان فلبی کے نام سے شائع ہوتی ہیں نہ کہ عبداللہ فلبی کے نام سے"۔

فلبی کو سعودی حکومت کی طرف سے ماہانہ وظیفہ ملتا ہے۔ اس کے متعلق امیر عبداللہ نے بتایا کہ یہ بہت معمولی ہے اور یہ شخص فقیر ہی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ تعجب ہے۔ غالباً آپ حضرات کو یہ خیال نہیں کہ اس کی بہت سی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور ان سب کی آمدنی اسے ملتی ہے۔

سعودی عرب کے معاشی مسائل دیر ہوگئی تھی۔ اس لیے مولانا نے پھر اجازت چاہی، لیکن امیر نے ابھی اور بیٹھنے کی خواہش کی۔ اب کی مرتبہ گفتگو سکندر مرزا اور ظفر اللہ خاں کی پختہ زناری پر رہی۔ پھر گفتگو کا رخ سعودی عرب میں زراعت و صنعت کی طرف پھر گیا۔ مولانا نے امیر کو توجہ دلائی کہ مملکت کو کم از کم خوراک میں خود کفیل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وقت تو، جیسا کہ ہم نے دیکھا اور سنا ہے، یہ حال ہے کہ کھانے اور پہننے کی ہر چیز حتیٰ کہ گوشت، ترکاری اور انڈے اور نمک اور پیاز تک باہر سے آتی ہے۔ مولانا نے اچھے انداز میں یہ بھی واضح کیا کہ صرف پٹرول کی آمدنی اور اس کے ذریعے باہر سے کھانے، پہننے اور دوسرے استعمالات کا جو سامان حاصل ہو جاتے۔ اسی پر بھروسہ کرتے رہنا بالآخر عربوں کو بڑی پریشان کن حالت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ امیر نے ان تمام باتوں کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ ہم نے زراعت کی ترقی کے لیے بے انتہا کوشش کی ہے۔ بہت سے لوگوں کو زمینیں بھی دی ہیں اور انہیں ہر طرح کی سہولت پہنچانے کا بھی انتظام کیا ہے لیکن لوگ ہیں کہ زراعت پر محنت نہیں کرتے اور اس کے بجائے تیل کی کمپنی میں ملازمت کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہاں معمولی کام پر خوب آمدنی ہوتی ہے لیکن بہرحال ہماری کوشش جاری ہے اور اس

بارے میں بڑے فکر مند ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے پھر اجازت چاہی تو امیر مولانا کو قصر کے باہر تک چھوڑنے آئے اور اس وقت تک ٹھہرے رہے جب تک ہماری موٹر روانہ نہیں ہوگئی۔ استاذ عبدالحکیم عابدین نے بتایا کہ امیر عبداللہ وزیر اعظم تک کو الوداع کہنے کے لیے قصر سے باہر نہیں آتے۔ گفتگو بھی وہ بڑی ہی محبت اور لگاؤ سے کرتے رہے۔

نظریاتی کشمکش اسی رات ہمیں ایک اور صحبت میں عرب کی دو اہم شخصیتوں کے درمیان ایک دلچسپ، اور گرما گرم بحث سننے کا اتفاق ہوا۔ جس سے سعودی عرب کی اندرونی حالت کے متعلق ہماری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ ان میں سے ایک صاحب علماء کی تعریف اور مدافعت کر رہے تھے، اور دوسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ "ان علماء کی عام نوجوانوں کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے، نوجوان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علماء اسلام کے صحیح نمائندہ نہیں ہیں" دوسری طرف سے شیخ عبدالعزیز بن باز کا نام لیا گیا۔ فریق مخالف نے کہا " وہ بلاشبہ بڑی، مخلص اور اپنی حدود تک عالم آدمی ہیں، لیکن ان کا دائرۂ معلومات بہت تنگ ہے اور یہ سوائے چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل بیان کرنے کے موجودہ زمانے کے بڑے اور اہم مسائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے حل پیش نہیں کر سکتے۔ مانا کہ یہ تمام علماء بے ایمان نہیں، لیکن عاجز ضرور ہیں" پہلے صاحب کہہ رہے تھے کہ "اصلاح بہر حال ان ہی علماء کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ ضرورت ان سے اچھے انداز میں کام لینے کی ہے" دوسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ "یہاں اصلاح نوجوانوں کے ذریعے ہوگی۔ اس وقت اسلام سے انحراف، بے دینی اور مغرب پرستی کی جو روح پھیلتی چلی جا رہی ہے اس کا مقابلہ کرنا ان علماء کے بس کا روگ نہیں۔ یہ علماء عوام کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور اس زمانے کی دوسری مفید ایجادات کے استعمال سے روکتے ہیں، حالانکہ یہ تعلیم پھیلے گی اور اس وقت یہ علماء کچھ نہ کر سکیں گے اور سوائے اس کے کہ ان کے خلاف عوام کی نفرت بڑھ جاتے اور کچھ نہ ہوگا۔ دوسری طرف یہ امراء کی عیاشیوں کو

دیکھتے ہیں، لیکن کچھ نہیں کر سکتے۔ شیخ عبدالعزیز بڑی ہی جرأت اور بے باکانہ انداز سے بادشاہ اور دوسرے امراء پر تنقید کرتے ہیں، لیکن بادشاہ اور بعض امراء تو بلاشبہ ان کی بڑی قدر کرتے ہیں، لیکن عام امراء اور اصحاب اقتدار خوب سمجھتے ہیں کہ ان کی گرمی اور تنقید کا وزن کیا ہے، اس لیے وہ ان کو خوش کرنے کے لیے بس چھوٹے چھوٹے معاملات میں ان کی باتوں کو مان لیتے ہیں۔"

ان دونوں صاحبوں کی زبانی ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی پریشانی ہوئی کہ یہاں کے امراء میں سے امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن اور مساعد بن عبدالرحمٰن کو چھوڑ کر قریب قریب سب ہی کے گھروں میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو اس زمانہ کے کسی مغرب زدہ گھرانے میں ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے بیٹے اور بیٹیاں انگریزی اور فرنچ پڑھتی اور بولتی ہیں، گھروں میں عورتوں کے لباس اور وضع قطع پوری طرح مغربی ہیں۔ بعض تو اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کے بیٹے اور بیٹیاں امریکہ ہی میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور ان کی استانیاں اور نگران سب کی سب امریکن عورتیں ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ نئی پود جب بڑھے گی اور اقتدار کی باگیں اس کے ہاتھ میں ہوں گی تو ملک کا کیا حال ہوگا۔

۱۱ بجے کے قریب ہم ہوٹل واپس آئے اور بڑی دیر تک اس صورتِ حال پر افسوس کرتے رہے۔[1]

قلبی سے دوسری ملاقات | اگلے دن (۲۵ نومبر) صبح ۱۰ بجے ہم سینٹ جان قلبی کی ملاقات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ قدیم ریاض کی ایک گلی میں ان کا مکان ہے۔ اگرچہ دو منزلہ ہے، لیکن بہت پرانا اور بوسیدہ ہے۔ اس میں وہ بالکل عربوں کی طرح رہتے ہیں۔ معاشرت میں انگریزیت کا کوئی رنگ نظر نہیں آتا۔ ہمیں انہوں نے اپنی لائبریری میں بٹھایا اور کافی دیر تک

---

[1] اس صورتِ حال پر تبصرہ مولانا کی اس تقریر میں آرہا ہے، جو انہوں نے جدہ میں کی۔ یہ تقریر ان شاء اللہ اس سفرنامہ کی اگلی قسط میں آ رہی ہے۔ (م۔ ع۔ ح)

مختلف کتابیں دکھاتے رہے۔ انگریزی رسالوں میں ان کے جو تازہ مضامین شائع ہوئے تھے وہ بھی ہمیں دکھاتے رہے۔ اب کی مرتبہ گفتگو انگریزی میں ہوئی۔ گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ ابھی چند سال ہوئے انہوں نے مدین کے علاقہ کا بھی دورہ کیا ہے، اس کے لیے مرحوم شاہ عبدالعزیز (موجودہ فرمانروا شاہ سعود کے والد) نے پندرہ ہزار ریال دیئے تھے اور ایک جیپ اور ایک کار کا بھی انتظام کیا تھا۔ انہوں نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ بھی بیان کیا اور وہ اس طرح کہ وہ جہلم میں ڈپٹی کمشنر تھے، اپنے دفتر کے ایک حافظ صاحب (جن کا انہوں نے نام بھی بتایا تھا، مگر میں بھول گیا) سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور اس طرح انہیں اسلام کے متعلق مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ کیمبرج میں پنڈت نہرو کے کلاس فیلو رہے ہیں۔ پھر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی اور سفر کے سلسلہ میں انہوں نے بعض مفید مشورے دیئے۔ مولانا اور چودھری صاحب کے انہوں نے پتے بھی اپنے پاس نوٹ کیے کہ شاید کبھی پاکستان آنا ہو تو ملاقات ہو سکے۔

عربی کھانے ظہر کے بعد مفتی اکبر کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ تین بجے کے قریب ہم ان کے ہاں پہنچے۔ مفتی صاحب نے دعوت کا خاص اہتمام کیا تھا اور آل الشیخ کے تقریباً سب ہی مشائخ کو مدعو کیا تھا، جن میں ان کے بڑے بھائی شیخ عبداللہ بن ابراہیم (جو نابینا ہیں اور بہت ضعیف ہونے کی وجہ سے ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے) بھی شامل تھے۔ پہلے ایک کمرے میں نشست رہی۔ پھر کھانے کیلئے دوسرے کمرے میں گئے۔ وہاں ایک بہت بڑی سینی میں چاولوں پر پورا بکرا سالم پکا کر رکھا ہوا تھا۔ مولانا نے تعجب سے پوچھا کہ پورا بکرا سالم کیسے پکا لیا جاتا ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ سالم بکرا پکا لینا تو کوئی چیز ہی نہیں، ابھی دو سال ہوئے حجاز کے کسی مقام پر بادشاہ کی دعوت میں ایک سوڈانی باورچی نے سالم اونٹ پکا کر پیش کیا تھا۔ مولانا نے فرمایا "اگر ہاتھی حلال ہوتا تو عرب کے باورچی شاید اسے بھی مسلّم پکا ڈالتے"۔ مفتی صاحب نے فرمایا "جی ہاں۔ ہمارے ہاں نجد میں بعض دیگیں اتنی بڑی بڑی ہیں کہ ان میں تین اونٹ ایک ساتھ پکائے جا سکتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا "غالباً یہ دیگیں حضرت سلیمانؑ کے وقت سے چلی آرہی ہوں گی"۔ اس دعوت میں

ایک اور لطیفہ ہمارا استاذ عبدالحکیم عابدین کھانے پر مولانا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے عربوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے مہمان کے سامنے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ڈالتے جاتے ہیں استاذ عبدالحکیم عابدین نے بکرے کی سری سے آنکھ نکالی اور مولانا سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ اسے کھانا پسند فرمائیں گے؟ مولانا نے جھرجھری لی اور یہ تحفہ لینے سے انکار کر دیا۔ معلوم ہوا کہ عربوں کے ہاں آنکھ کو بڑا ہی مزے دار تصور کیا جاتا ہے اور اسے بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ ہمارے لیے یہ چیز بڑی ہی حیرت انگیز تھی۔

کھانے کے بعد پھر نشست رہی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس مجلس میں مفتی صاحب نے بھی یہ بات دوہرائی کہ اگر ابن تیمیہؒ اور محمد بن عبدالوہابؒ کا کوئی قول حدیث کے خلاف ہوتا ہے، تو ہم اسے ترک کر دیتے ہیں۔

عرب میں لونڈی غلاموں کی خرید و فروخت عصر کے بعد ہندوستان کے چند طلبہ نے، جو ریاض کے کلیۃ الشریعہ یا اس کے تحت معہد میں پڑھتے ہیں، ہمیں اپنے ہاں جانے پر بلایا تھا۔ اس وقت سخت بارش ہو رہی تھی، لیکن یہ حضرات ہمیں لینے کے لیے بروقت پہنچ گئے۔ ہمیں قدیم ریاض کی ایک گلی میں جانا تھا۔ بارش میں تمام گلیوں کا بہت ہی برا حال ہو رہا تھا اور پرنالوں سے پانی گزرنے والوں کے سروں پر گر رہا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے۔ بہت ہی خستہ اور تنگ و تاریک قسم کا مکان تھا۔ معلوم ہوا کہ کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کے لیے قیام کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں ہے، اپنے طور پر جو طالب علم کہیں انتظام کر سکتا ہے کر لیتا ہے۔ ریاض کے بہت سے لوگوں نے نئے محلوں میں پختہ مکان بنا لیے ہیں اور اپنے پرانے کچے مکانات وقف کر دیئے ہیں۔ عموماً طلبہ کا قیام ان ہی مکانوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جس مکان میں ہم پہنچے تھے، وہ بھی اسی قسم کا مکان تھا۔ وہاں طلبہ کے علاوہ شیخ عبدالرزاق عفیفی سے بھی ہماری ملاقات ہوئی۔ ان سے تسری یعنی لونڈیوں ـــ کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ سعودی عرب میں اس زمانہ میں بھی غلاموں اور لونڈیوں کا رواج ہے۔ شیخ عفیفی نے بتایا کہ یہاں جو غلام اور لونڈیاں آتی ہیں وہ یا تو مسقط اور عمان کی طرف سے